فقه المعاملات

آخری قسط

جهیز میں سامان یا نقد رقم کا مطالبہ شرعی احکام کی روشنی میں

مولانا برہان الدین سنبھلی

رئیس دار الافتاء دار العلوم ندوة العلماء لکھنؤ (انڈیا)

عورت کے خویش واقرباء جو کچھ رقم اپنے لئے لے کر نکاح کرتے ہیں، یہ رشوت ہے۔ رقم لینا اور دینا جائز نہیں، اور اگر دے دی ہے تو شوہر کو حق ہے کہ بعد نکاح واپس لے لے۔ کذا ذکرہ الشامی فی باب المہر۔ (اس کے بعد مفتی صاحبؒ نے البحر الرائق کی ''شامی'' کے حوالہ سے وہ فقہی روایت نقل کی ہے جس کا ذکر اوپر مع حوالہ آچکا ہے) خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس زمانہ میں جس قسم کی خلافِ شرع رسوم ورواج کا عموم ہوا، علمائے امت نے بروقت اس کے سدّ باب کی کوشش کی اور حکم شرعی کا برملا اظہار کر کے اتمام حجت کیا، لیکن ادھر کچھ مدت سے مذکورہ رسم کے بالکل برعکس یعنی بجائے شوہر سے رقم کے مطالبہ کرنے کے شادی کے وقت لڑکی (یا اس کے اولیاء) سے رقم وغیرہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جو بسا اوقات اتنی خطیر رقم کا ہوتا ہے کہ غریبوں کا تو ذکر ہی کیا، متوسط الحال لوگوں کے لئے بھی اس کا پورا کرنا آسان نہیں ہوتا، بعض علاقوں میں تو یہ رسم وبا کی طرح پھیل رہی ہے، جس کے نتیجے میں ایسے ہولناک مسائل کھڑے ہو رہے ہیں کہ ان کی تفصیل جان کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسانیت کی پیشانی ندامت سے عرق آلود ہو جاتی ہے، اس کا ایک محسوس اور کھلا ہوا ضرر اور نقصان تو یہ سامنے آرہا ہے کہ لڑکیاں بغیر شادی کے بوڑھی اور سن رسیدہ ہو جاتی ہیں کیونکہ شوہر ''خریدنے'' کے لئے ان کے یا ان کے اولیاء کے پاس رقم نہیں ہوتی اس کے علاوہ فطری اور طبعی تقاضہ کے صحیح طریقہ پر پورے نہ ہونے کی وجہ سے جو مفاسد پھیلتے یا پھیل سکتے ہیں، ان کا اندازہ کر لینا بھی کسی باشعور کے لئے مشکل نہیں، مثلاً بدکاری عام ہوتی، قحبہ خانوں کی آبادی بڑھتی، بلکہ بعض مرتبہ ارتداد تک کی نوبت آجاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔

یہ رسم یقیناً فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بھی اُلٹی ہے اور شریعت کے عطاء کردہ قانونی مزاج کے اعتبار سے بھی، کیونکہ اللہ نے ''عورت'' کو اس کی صنفی خصوصیات کے لحاظ سے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی ''حجة اللہ البالغہ'' میں اشارہ کیا ہے، (دیکھئے حجۃ اللہ ج: ۱ ص: ۴۱ مطبوعہ ادارة الطباعة المنیریة ۱۳۵۲ھ، باب تدبیر المنزل)

مطلوب بنایا ہے اور مرد کو طالب یہی وجہ ہے کہ مرد پر بوقت نکاح مہر لازم کیا ہے عورت پر نہیں (قرآن مجید کی متعدد آیات مثلاً: ''اَن تَبتَغُوا بِاَموَالِكُم محصنينَ غيرَ مسافحين ط فما استمتعتم به منهن فَاٰتُوهُنَّ اُجُورَهُنَّ فريضةً ط'' (النساء: ۲۴)
''وَبِمَآ اَنفَقُوا مِن اَموَالِهِم'' (النساء: ۳۴ اس پر صراحةً دلالت کرتی ہیں)

(بلکہ وہ تو مہر پانے کی مستحق قرار دی گئی ہے) اس لئے یہ قبیح رسم کم سے کم مسلمانوں میں کچھ عرصہ پہلے تک عام نہیں تھی (کچھ محدود علاقوں

اور برادریوں کو چھوڑ کر)) بلکہ اس کے برخلاف لڑکے سے رقم لینے کا رواج تھا، جس کا ایک اہم ثبوت مذکورہ بالا فقہی نصوص اور فتاوی ہیں اور غالباً پچاس، پچپن سال یا اس سے زیادہ عمر کے لوگ ابھی اس بات کو بھولے نہ ہوں گے کہ لڑکے کی شادی ہندستان کی اکثر خطوں میں ایک مسئلہ ہوتی تھی، لڑکی کی نہیں، اس لئے مذکورہ بالا فتاوی میں لڑکی یا اس کے اولیاء سے رقم کا مطالبہ کرنے کی بابت کوئی فتوی بمشکل ہی ملتا ہے، بتانے کی ضرورت نہیں کہ علماء کے فتاوی زمانے کے رجحان و رفتار کا سچا آئینہ ہوتے ہیں۔لیکن اب ہندوستان کے مسلمان بالخصوص حیدر آباد، بہار، یوپی وغیرہ کے لوگ اس رسم بلکہ وبا میں اس طرح گرفتار ہیں کہ اس سے نجات اور چھٹکارے کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی ہے، اور اس کی وجہ سے ہولناک مشکلات میں مبتلا اور خطرناک اندیشوں سے دوچار ہیں، اس لئے علماء و مصلحین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی سی پوری کوشش اس قبیح رسم کو اکھاڑ پھینکنے کی کریں، جو فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بھی نا معقول ہے اور شرعی اصول سے بھی نہایت ناپسندیدہ اور مکروہ۔اس کی شرعی حیثیت جاننے کے لئے تو تنہا وہی فقہی نصوص و فتاوی کافی ہیں جو اوپر ذکر میں آئے، کیونکہ اصل صورتِ مسئلہ یہاں بھی وہی ہے جو وہاں ہے، اس فرق کے ساتھ کہ وہاں ''ناکح'' سے رقم طلب کی جاتی تھی، جس کے کسی درجہ میں جواز کی بظاہر گنجائش نظر آتی تھی، اور شاید اسی لئے قدیم فقہاء نے جس صراحت و تاکید سے یہ مسئلہ بیان کیا ہے اتنی قوت سے اس کی معکوس صورت کا نہیں کیا کہ جس سے ہم آج کل دوچار ہیں یعنی منکوحہ (یا اس کے والدین سے) رقم کا مطالبہ، کیونکہ اس کا بھی حکم ان ہی نصوص و فتاوی سے نسبتاً بآسانی معلوم ہو سکتا ہے، جب لڑکے سے مطالبہ کرنا حرام ہے تو لڑکی سے مطالبہ کرنا بطریقِ اولیٰ حرام ہوگا، ایسے مطالبہ کی بنیاد پر ملنے والی رقم شرعاً ''رشوت'' ہوگی جس کا لینا دینا اور اس کے لئے واسطہ بننا سب حرام ہے، اور از روئے حدیث ایسے سب لوگ ملعون ہوتے ہیں، ''کشف الخفاء'' میں یہ حدیث نمبر ۲۰۴۸ پر الفاظ مذکور ہے:

''لعن الله الراشِيَ وَالْمُرتَشِي والرائش۔'' روه احمد بن منيع عن ابن عمر وسنده حسن وفي الباب عن عبدالرحمٰن بن عوف وعائشة وأُمّ سلَمة واخرين وروى الطبرانى عن ابن مسعود انه قال:الرشوة فى الحكم كفر وهي فى الناس سحت'' روه احمد والطبرانى والبزار عن ثوبان بلفظ ''لعن الله الراشى والمرتشى والرائش ،الزى يمشى بينهما ۔'' موجودزمانہ کے مشہور عالم حدیث شیخ ناصرالدین الالبانی نے حاشیہ مشکوٰۃ میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔(دیکھئے حاشیہ مشکوٰۃ ج:۲ ص:۳۳۹ مطبوعہ دمشق) اس لئے اس کا واپس کرنا شرعاً واجب ہے جیسا کہ ''قنیہ'' کے حوالہ سے علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے۔(ردالمحتار ج:۴ ص:۳۰۴ مطبوعہ دیوبند)

''وفي القنية الرشوة يجب ردها ولا تملك'' ج:۲ ص:۳۲۹ قنیة فقہ کی معتبر کتاب میں ہے کہ رشوت کا واپس کرنا ضروری ہے (کیونکہ لینے والے مالک نہیں بنتا) ''رشوت'' کے معنی حاشیہ میں اس سے پہلے ''مجمع البحار'' کے حوالہ سے گزر چکے ہیں کہ حیلہ بازی سے کام نکالنے کے لئے (مال کو) ذریعہ بنانا۔''وصلة الى الحاجة بالمصانعة'' نقد رقم کی طرح سامان کی

فرمائش بھی اسی حکم میں آتی ہے، یعنی ''جہیز'' مانگنے کا بھی شرعاً یہی حکم ہے، خلاصہ یہ کہ لڑکے (یا اس کے اولیاء) کی جانب سے لڑکی (یا اس کے اولیاء) سے اس طرح کا جو بھی بوقت نکاح (یا نکاح سے پہلے) مطالبہ ہوگا وہ شرعاً غلط اور ناجائز ہوگا، اور اس مطالبہ (مطالبہ خواہ صاف لفظوں میں ہو یا اشاروں کنایوں میں یا رواجی ہو، سب کا حکم یکساں ہے، تفصیل آگے آرہی ہے۔) کے نتیجہ میں جو کچھ لڑکی (یا اس کے اولیاء) کی طرف سے لڑکے کو یا اس کے عزیزوں کو دیا جائے گا، وہ مالِ حرام (رشوۃ) ہوگا، اگر اس کا نام ''ہبہ'' رکھ لیا جائے تو فقہی اصطلاح میں یہ ہبہ باطل ہوگا (اس لئے اس مال کا استعمال بھی، لینے والے کیلئے حرام ہوگا) اس مسئلہ کے لئے مزید حوالوں اور فقہی نظائر کی ضرورت تو مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد نہیں معلوم ہوتی، لیکن توضیح مزید کیلئے چند حوالے اور ذکر کئے جاتے ہیں (جو صراحۃً لڑکی سے مطالبہ کے بارے میں ہیں) مثلاً حنفی فقہ کی معتبر ترین کتاب ''فتاویٰ قاضی خان'' میں ہے:

(كتاب النكاح ،فصل في النكاح على الشرط)إمرأة طلقها زوجها فارادت أن يتزوجها الزوج،فقال الزوج:لاأتزوجك حتى تهبيني مالك عليّ من المهر،فوهبت مهرها على أن يتزوجها.قال ابو القاسم الصفار رحمة الله تعالىٰ:الهبة باطلة ،وفي الشرط أولم يف لأنها جعلت المال عوضا للزوج على نكاحها،وفي النكاح لايكون العوض على المرأة (فتاویٰ قاضی خان ج: ۱ ص:۲۷۸ ''مطبع ایشیاٹک لیتھوگرافک طامس بلاک کلکتہ ۱۸۳۵ء) عورت پر مالی عوض عائد نہ ہونے اور نکاح میں (عورت کی طرف سے) مال کا ملنا مقصود نہ ہونے کی بات دیگر کتبِ فقہ مثلاً شامی وغیرہ میں بھی ملتی ہے۔ دیکھئے دستیمان کی بحث)۔

ترجمہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو (ایک یا دو) طلاق دی، پھر دوبارہ اسی عورت نے اس طلاق دینے والے شخص سے نکاح کرنا چاہا تو اس نے یہ شرط لگائی اور عورت سے کہا کہ تم پہلے نکاح سے واجب ہونے والا مہر جب تک نہ دوگی (یا ساقط نہ کروگی) تب تک نکاح نہ کرونگا۔ اس مسئلہ کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ عورت مہر دیدے گی تب بھی اس کا دینا صحیح نہ ہوگا اور شرعاً یہ ہبہ باطل ہوگا، خواہ وہ وعدہ پورا کرے یا نہ کرے کیونکہ اس شکل میں عورت پر نکاح کا مالی عوض دینا لازم آتا ہے حلانکہ شریعت نے عورت پر نکاح کا کوئی مالی عوض عائد نہیں کیا ہے۔

اس مسئلہ میں خاص طور پر یہ امر قابل غور ہے کہ ہونے والا شوہر مخطوبہ عورت سے الگ سے کوئی مالی مطالبہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ اس شوہر پر سابق نکاح کی وجہ سے جو حق عورت کا واجب تھا وہ اس سے صرف اس کے ساقط کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے (یا اپنی دی ہوئی رقم یا مال واپس لینا چاہتا ہے) اسے بھی فقیہ مذکور جائز نہیں کہتے، لیکن اگر نقد یا سامان کا ہونے والے شوہر کی جانب سے مستقل مطالبہ ہو تو مسئلہ کی سنگینی اور اس کی حرمت میں شدت کتنی بڑھ جائے گی! اس کا اندازہ کسی صاحب علم کیلئے مشکل نہیں، مذید قابل توجہ بات اس مسئلہ کی وہ دلیل ہے جس کی بنیاد پر یہ حکم شرعی اخذ کیا گیا ہے، یعنی عورت کی طرف سے نکاح کا عوض دیا جانا، جبکہ شریعت نے عورت پر نکاح کا کوئی مالی بدل نہیں مقرر کیا ہے (بلکہ مرد پر کیا گیا ہے)، اس اُصول و دلیل کو سامنے رکھ کر اس صورتِ حال کا حکم، جو یہاں زیر بحث ہے اور جس سے ہندوستانی مسلمان آجکل دوچار ہیں بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ کہ یہ صورت قطعاً غیر شرعی ہے اور ایسے مطالبہ کے نتیجہ میں زوج کو

(از جانبِ زوجہ) جو کچھ دیا جائے گا وہ شرعاً درست نہ ہوگا، اور ہبہ باطل (جس کے نتیجہ میں حاصل شدہ مال حرام ہوگا) اسطرح کا ایک اور جز ئیہ فتاویٰ عالمگیری میں بطور قانون شرعی ذکر کیا گیا ہے (اہل علم جانتے ہی ہیں کہ فتاویٰ عالمگیری کو ممتاز ترین علماء کی ایک جماعت نے عالمگیرؒ کی ہدایت ونگرانی میں اسی لئے مرتب ومدوّن کیا تھا کہ وہ قوانین شریعت کا معتبر مجموعہ یا دستورِ اسلامی برائے مملکت ہندوستان قرار پائے، چنانچہ اس میں فقہاء کے مختلف اقوال میں سے قول مختار کے انتخاب کا التزام کیا گیا ہے) وہ جز ئیہ عالمگیری میں اس طرح ہے:۔

رجل قال لمطلقته لا أتزوجک مالم تهبینی مالک علی من المهر فوهبت مهرها علی أن یتزوجها ثم أبی أن یتزوجها فالمهر باق علی الزوج تزوج أولم یتزوج (عالمگیری ج: ۱ ص: ۳۱۷ "طبع ۱۲۱۰ھ")

ایسی ہی عبارت اور اس کا ترجمہ ابھی اوپر گزر چکا ہے، اُس میں اور اس میں صرف معمولی فرق ہے (جو اصل مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوتا) البتہ یہاں اصل مسئلہ (ہبہ باطل ہونے) کی وہ حکمت وعلّت بیان نہیں کی گئی جو اوپر (فتاویٰ قاضی خان) کی عبارت میں مذکور ہوئی (آگے مزید وضاحت آ رہی ہے)۔

فتاویٰ قاضی خان کی عبارت کی تشریح کے بعد اس عبارت کی وضاحت چنداں ضروری نہیں رہ جاتی کیونکہ جیسا کہ ابھی بیان ہوا، اس میں بھی تقریباً وہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے (جزوی فرق کے ساتھ) البتہ یہاں اس حکم کی علّت ذکر نہیں کی گئی ہے، وہاں ذکر کر دی گئی ہے، علاوہ ازیں مشہور اندلسی مغربی وسیع النظر عالم ابن حزم الظاہریؒ (ف ۴۵۶ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "المحلّی" میں واضح طور پر شرعی حکم یہ بتایا ہے کہ عورت کو جہیز دینے پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں، نہ مہر کی رقم سے اور نہ کسی دوسرے مال سے، اصل عبارت یہ ہے:۔

لا یجوز أن تجبر المرأة علی أن تتجهز الیه بشیء اصلاً لا من صداقها ولا من غیره من سائر مالها، والصداق کله لها تفعل فیه ما شاء ت ۔(المحلی ج: ۱۱ ص: ۱۱۹ مکتبة الجمهوية العربية، بجوار الازهر مصر ۱۳۹۰ھ، ۱۹۷۰ء)

ترجمہ:۔ عورت کو کچھ چیز دینے پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں، نہ مہر کی رقم سے اور نہ اس کے کسی دوسرے مال سے، پورا مہر اسی کا ہے اور اسے اس پر پورا حق ہے جو چاہے کرے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ صورت حال کہ عورت (مخطوبہ) سے رقم یا سامان کا مطالبہ ہو کم سے کم مسلمانوں میں نئی ہے، غالباً برادرانِ وطن سے جس طرح اور بہت سی قبیح وخطرناک رسمیں لے لی گئی ہیں، ایسی ہی ایک رسم یہ بھی لے لی گئی ہے شاید اس کی بنیادی وجہ بھی وہی ہے جو اُن کے یہاں ہے، یعنی لڑکیوں کو وراثت میں حصہ نہ دینا، جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں بھی رواج پا گیا ہے، حالانکہ دیگر شرعی ورثاء کی طرح لڑکیوں کو بھی ان کے شرعی حصہ کے مطابق وراثت دینا ضروری ہے کیونکہ قرآن مجید میں اسے "فریضہ" (فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ "النساء ۱۱") قرار دیا گیا ہے، مگر افسوس کہ اس "فریضہ" کو عام طور پر ترک کیا جا رہا ہے جس کی ایک نقد سزا مسلمانوں کو بعید نہیں کہ جہیز اور تلک کے عذاب کی شکل میں مل رہی ہو۔ یہاں یہ ذکر کرنا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ چونکہ عام

مسلمانوں میں یہ نیا رواج ہے اس لئے ہمارے فقہ وفتاویٰ کے اکثر مآخذ اس مسئلہ کی بابت عام طور پر خاموش ہیں، لیکن تلاش بسیار کے بعد بہرحال کچھ نظائر مل ہی جاتے ہیں۔ (جن میں سے تین کا حوالہ قدیم ذخیرہ سے ہی نکال کر اوپر پیش کیا جاچکا ہے)، ماضی قریب کے ایک ممتاز فقیہ اور مرکزِ علوم اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے مجموعۂ فتاویٰ سے ایک سوال وجواب ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

سوال ۲۷۰:۔ ایک شخص نے نکاح کی تجویز کی، بعد کو معلوم ہوا کہ لڑکی چھوٹی ہے، پھر اس لڑکی کے عوض دوسری لڑکی تجویز کی، اور لڑکی کے ہمراہ دوسو روپے دیئے، یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ یعنی لڑکی بھی دی اور دوسو روپے بھی، اس سوال کا جواب مفتی صاحبؒ یہ لکھتے ہیں:

الجواب :۔ اگر دوسری لڑکی کے اولیاء راضی ہیں تو نکاح درست ہے، اور دوسو روپے کا لینا حرام ہے (کیونکہ) یہ رشوت ہے، اس کو واپس کرنا چاہئے۔ اس جواب فتاویٰ دارالعلوم مدلل ومحشی جلد ہفتم ص:۲۴۱) سے اندازہ ہوتا ہے کہ صورتِ مسئلہ یہی رہی ہوگی کہ دوسری (بڑی) لڑکی سے شادی کرنے پر لڑکا (یا اس کے اولیاء) اسی شرط پر راضی ہوئے ہوں گے کہ لڑکی (یا اس کے اولیاء) دوسو روپے یا کوئی معتدبہ رقم دیں، اسی لئے یہ رقم دی گئی یا پھر کم سے کم یہ بات ضرور ہے کہ مفتی صاحبؒ نے اس سوال کا مطلب یہی سمجھے تھے، اس طرح بھی بہرحال یہ تو ثابت ہوتا ہی جاتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے نزدیک اس صورت کا حکم شرعی یہی ہے ورنہ بخوشی اور بغیر طلب کے اپنی لڑکی کو کچھ دینا جائز ہے (اس لئے اس کا واپس کرنا بھی ضروری نہیں) لیکن یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جس طرح ''صراحۃ'' ہوتا ہے، اسی طرح دلالۃً (اشاروں، کنایوں میں یا رواج کے طور پر) بھی ہوتا یا ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں یعنی غیر صریح مطالبہ کی صورت میں بھی شریعت کا حکم مطالبہ والی شکل کا سا ہوگا (یعنی ایسا مال لینا شرعاً ناجائز ہوگا، رشوت ہونے کی بنیاد پر) (مشہور قاعدہ فقهیه ''المعروف كالمشروط'' الشامی ج ۱ ص :۶۵۲ کی بناء پر) لیکن اگر صریح مطالبہ نہ ہو تو ممانعت کا حکم تب لگے گا جبکہ غالب گمان یہ ہو کہ جہیز یا نقد کی فلاں مقدار اگر نہ دی جائے گی تو یہ رشتہ منظور نہیں کیا جائے گا اس کا حکم کا ایک مأخذ ''وسیلہ احمدیہ'' نامی کتاب کی یہ عبارت ہے: ''بناء علىٰ عدم رضائه علىٰ تقدير عدمه'' جو اوپر ''مجموعۂ فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ'' کے حوالہ سے تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔)

یا رشتہ ہو جانے پر انقطاعِ تعلق یا شدید ایذا رسانی وغیرہ کی شکل پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔ لیکن اگر کسی طرف سے کوئی مطالبہ صاف الفاظ یا اشاروں، کنایوں میں بھی نہ ہو تو پھر کچھ لینا دینا بالکل جائز ہوگا، بشرطیکہ اس کا مقصد نام ونمود یا اس جیسی اور کوئی فاسد غرض نہ ہو اور بخوشی اور بآسانی مہیا کر کے دیا گیا ہے۔ (اس طرح جہیز دینے کا ذکر قدیم زمانہ سے ملتا ہے، جس کا پتہ فقہی کتابوں سے بھی چلتا ہے۔ مثلاً دیکھئے ''بدائع الصنائع'' للکاسانی ج:۲ ص:۲۴۳، ۳۹)

مگر جہیز چاہے ان سب شرطوں کو ملحوظ رکھ کر دیا گیا ہو جن کا ذکر اوپر آیا، پھر بھی اس نام سے ایسا لین دین جس کا مدت سے رواج چل رہا ہے، اسے سنت سمجھنا محلِ نظر ہے، کیونکہ اول تو رواجی جہیز میں عموماً یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ ہونے والے داماد کو اس سامان کی ضرورت ہے

بھی یا نہیں؟ بلکہ وہ اگر چہ بے حد خوشحال ہو اور اس کا گھر سامان سے بھرا ہو تب بھی جہیز دیا جاتا ہے، بعض لوگ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا اپنی ایک صاحبزادی حضرت زینبؓ (بنت رسول اللہ ﷺ) کو ان کی شادی کے وقت ''ہار'' دینا بھی جہیز کے سنت ہونے کے لئے سند خیال کرتے ہیں، لیکن یہ سند اور بنیاد بہت زیادہ کمزور ہے، کیونکہ اول تو یہ فعل ام المومنین کا تھا آنحضرت ﷺ کا نہیں تھا اور وہ بھی قبل از نبوت زمانہ میں۔ یعنی جبکہ (آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہونا شروع نہیں ہوئی تھی، اگر بعثت کے بعد کا یہ واقعہ ہوتا تو بھی محض اس سے جواز ثابت ہوتا (تقریری حدیث کے امکان کی بناء پر) اس عمل کا سنت ہونا ثابت نہ ہوتا۔

مگر جب یہ معلوم و ثابت ہے کہ یہ واقعہ قبل از بعثت کا ہے تو اہل علم جانتے ہی ہیں کہ جواز پر بھی استدلال کی گنجائش نہیں رہ جاتی، چہ جائیکہ سنت ہونے پر، یہ الگ بات ہے کہ بغیر کسی صریح یا غیر صریح شرط کے اور بلا نام و نمود بآسانی مہیا کر کے شادی کے موقع پر بھی کچھ دینے کا جواز دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

ابوالعاص سے حضرت زینبؓ کی شادی، جس میں ہار دیا گیا تھا، کا قبل از نبوت ہونا، دوسری تیسری صدی ہجری کے معروف و مستند مؤرخ عبدالملک بن ہشام (المتوفی ۲۱۳ یا ۲۱۸ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''سیرۃ ابن ہشام'' میں زیرِ عنوان ''سبب زواج ابی العاص من زینب'' اس طرح بیان کیا ہے:۔

كان ابوالعاص من رجال مكة المعدودين مالا وامانة وتجارة.......وكان خديجة خالته فسألت خديجه رسول الله وكان رسول الله ﷺ لا يخالفها، وذلك قبل ان ينزل عليه وسلم بنبوته آمنت به خديجة وبناته ....وثبت ابوالعاص على شركة (سيرت ابن هشام ج:۱، ۲ ص:۱۵۱، ۱۵۲، بتحقيق مصطفى السقاء وغيره)

ترجمہ:۔ ابوالعاص، تجارت، امانت اور امانت اور دولت میں مکہ کے چند ممتاز لوگوں میں سے تھے، اور حضرت خدیجہؓ ان کی خالہ تھیں، چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے خود ہی رسول اللہ سے درخواست کی کہ آپ ابوالعاص سے (زینب کی) شادی کر دیں، رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہؓ کی رائے کے خلاف نہیں کرتے تھے، اور یہ واقعہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ جب آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا تو حضرت خدیجہؓ اور آپ کی تمام بیٹیاں ایمان لے آئیں مگر ابوالعاص شرک پر قائم رہے (پھر خاص مدت کے بعد وہ بھی ایمان لے آئے) علاوہ ازیں مشہور حافظ حدیث ابن حجر عسقلانیؒ نے صحابہؓ کے احوال پر اپنی مستند ترین کتاب ''الاصابہ'' میں ابوالعاص کے تذکرہ میں جو انداز اختیار کیا ہے اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔

مزید برآں یہ کہ حضرت زینبؓ کی چھوٹی بہن حضرت ام کلثوم کے نکاح کے بارے میں متعدد اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ وہ بھی قبل از نبوت ہوا تھا (مثلاً: حافظ ابن عبدالبرؒ اور زرقانیؒ نے بیان کیا ہے، دیکھئے زرقانی شرح مواہب ج:۳ ص:۱۹۸) اور عصرِ حاضر کے ممتاز محقق، سیرت نگار حضرت العلامہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی مشہور زمانہ ''سیرت النبیؐ'' (جلد دوم تقطیع کلاں ص:۳۴۰، طبع اول ۱۹۲۰ء)

میں حضرت زینبؓ کی دوسری چھوٹی بہن حضرت رقیہ کی شادی کا بھی، ابن سعد کے حوالہ سے قبل از نبوت ہونا ثابت کیا ہے، تو پھر بڑی بہن کا قبل اَز نبوّت ہونا اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت فاطمہؓ کو ان کی شادی کے وقت جو گھریلو سامان دیا گیا تھا اسے بھی موجود جہیز کے رواج کیلئے سند بنانا درست نہیں۔ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا چار بیٹیوں میں سے صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ کو دینا اس غرض سے تھا کہ حضرت علیؓ کی مستقل علیحدہ سکونت کا انتظام نہ تھا، تو ظاہر ہے کہ گھریلو سامان کی موجودگی کا بھی کوئی سوال نہیں تھا، علاوہ ازیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سرپرست بھی آنحضرت ﷺ ہی تھے، (جیسا کہ تمام اربابِ سیر نے لکھا ہے، مثلاً مشہور محدث و مؤرخ حافظ ابن عبد البرؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''الاستیعاب'' میں ہے:۔ کان ابو طالب ذاعیال کثیر ....فأخذ رسول الله ﷺ علیاًفضمّه الیه .....فلم یزل علیؓ مع رسول الله حتیٰ زوجه من فاطمه۔'' (الاستیعاب ج:۱ ص:۳۸ مکتبه نهضة، مصر)۔ اگر اس موقع پر آپ سامان نہ دیتے تو بھی بظاہر اس کا نظم آپ ہی کو کرنا پڑتا، ان سب سے بڑھ کر جہیز کے موجودہ طریقہ کے سنت نہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ گھریلو سامان جو حضرت فاطمہؓ کو آپ ﷺ نے بوقت رخصتی (یا اس کے بعد دیا تھا، جسے عوام جہیز دینا کہتے ہیں) وہ خود حضرت علیؓ کی طرف سے فراہم کردہ رقم سے خرید کر دیا تھا، جس کی صراحت اہلِ سیر نے کی ہے، مثلاً زرقانی (شرح موہب) میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو وہ زرہ فروخت کرنے کا حکم دیا جو انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو دی تھی، اس کے بعد کا واقعہ ''زرقانی'' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

فبعتها من عثمان بن عفان بأربعمائة وثمانين درهما ،ثم ان عثمان رده لدرع الى عليّ فجاء بالدرع والدراهم الى المصطفىٰ ﷺ فدعا لعثمانؓ كثيرةفجئته بها فوضعتهافى حجرى فقبض منها قبضة..... فقال اى بلال....ابتع بها لنا طيبا ....وفى رواية ابن ابى خيثمةعن عليّ أمر ﷺ أن يجعل ثلث ....فى الطيب ....ووقع عند ابن مسعود وابى يعلىٰ بسندضعيف عن عليّ فقال اجعلوا ثلثين فى الطيب وثلثا فى الثياب ، وامرهم ان يجهزوهالها سرير مشروط اى مجعول فيه شرائط اى حبال ووسادة من أدم حشوها ليف..... الخ (زرقانی شرح مواہب ج:۲ ص:۴۰۳ للامام محمد بن عبد الباقی الزرقانی)

ترجمہ:۔ تو میں نے وہ زرہ حضرت عثمان بن عفان کے ہاتھ پر چار سواسی درہم میں فروخت کر دی، مگر اس ساری رقم کے ساتھ زرہ بھی حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو دے دی جس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان کو بہت زیادہ دعائیں دیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: میں وہ سب رقم لے کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ: اس رقم کے ایک حصہ سے خوشبو خرید لاؤ...... (ان ہی سے یا کسی اور سے فرمایا) اور ایک حصہ سے کپڑے وغیرہ، اور فرمایا کہ اس سے (فاطمہؓ کے لئے) پلنگ کا سامان مہیا کر دو۔ چنانچہ ایک (خاص قسم کا عربی) بستر اور چمڑے کا تکیہ وغیرہ تیار کروایا گیا..... الخ

علاوہ ازیں ہندوستان کے مشہور و مستند اور وسیع النظر صاحبِ درس عالم مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروئیؒ اپنی مقبول عام سیرت کی کتاب ''تواریخ حبیب الہٰ'' کی چوتھی فصل میں لکھتے ہیں:۔

حضرت علیؓ سب دراہم زرہ کی قیمت حضور میں لائے، آپ ﷺ نے ایک مٹھی حضرت بلالؓ کو دی کہ ان درہموں کی خوشبو فاطمہؓ کیلئے لے آؤ، اور باقی آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کو دے کر فرمایا کہ: اس سے جہیز خانہ داری کا سامان بی بی فاطمہؓ کا کر دو ایک پلنگ۔ (تواریخ حبیبِ الہٰ ص:۔۴۴ ''مطبع نظامی کانپور'') شاید اسی سے ماخذ وہ رواج ہے جو 'اعاجم' یعنی غیر عرب باشندوں میں 'دستیمان' یا دستفیمان'' کے نام سے غالباً بعض عرب ملکوں کے اندر کم سے کم علامہ شامیؒ کے دور تک جاری رہا، اور کیا بعید ہے کہ اب تک رائج ہو، جس کا مطلب ان فقہاء نے یہ بتایا ہے کہ خاطب (لڑکا) مخطوب (منگیتر) یا اس کے اولیاء کے پاس مہر کے علاوہ ایک معقول رقم اس غرض سے بھیجتا تھا کہ اس سے مخطوب کے ''جہیز'' کا سامان خرید ا جائے پھر اسے بعد نکاح خاطب (شوہر) کے گھر بھیج دیا جائے، ایسی صورت میں شوہر کو شرعاً یہ حق پہنچتا تھا کہ ''جہیز'' نہ لانے کی صورت میں وہ اس منکوحہ کے اولیاء سے دستیمان کے بقدر ''جہیز'' کا مطالبہ کر سکے، کیونکہ علامہ شامی کے الفاظ میں وہ دراصل ''ہبہ بشرط العوض'' ہے یعنی ''دستیمان'' کے عنوان سے جو رقم مخطوب (یا اس کے اولیاء) کو بھیجی تھی، وہ اسی کام کے لئے بھیجی تھی، (گویا اس رقم سے سامان خریدنے کیلئے ایک طرح کے وکیل کی سی حیثیت ان کی ہوتی تھی)

اس مسئلہ کی سب سے زیادہ تفصیل ''قنیة'' اور البحر الرائق'' میں ملتی ہے، وہاں سے لے کر صاحبِ ''درمختار'' اور اس کے شارح علامہ ابن عابدینؒ نے اپنی اپنی کتابوں میں کچھ تنقیح اور تجزیہ کے بعد جگہ دی ہے (البحر الرئق، قنیة، درمختار، شامی وغیرہ مشہور فقہی کتابوں میں اس کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ علامہ شامیؒ نے اسے 'اعاجم کا دستور' بتایا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں لفظ ''دستیماں'' استعمال ہوا ہے، جو فارسی لفظ ہے، دیکھئے۔ عالمگیری ج:ا ص :۳۲۸، ردالمحتار ج:۲ص:۳۶۷، ۳۶۸ ج:۲، ص:۶۵۲، ۶۵۳ قنیة ص:۸۶، ۸۷، البحر الرائق ج:۲ ص:۲۰۰)

خلاصہ کلام:

کہ شوہر کی بھیجی یا دی ہوئی رقم سے گھریلو سامان خرید کر لڑکی کے ساتھ بھیجنا بھی ''جہاز'' کہلاتا تھا، لیکن کہاں یہ اور کہاں وہ؟ (کہ جس کا رواج آج کل ہندوستان جیسے ملکوں کے مسلمانوں میں پڑ گیا ہے) عرض کرنے کا حاصل یہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مذکور اس قسم کے جزئیات سے موجودہ جہیز کی جو شکل ہے، اس بارے میں استدلال کرنا، کسی طرح درست نہیں (اس کی تفصیل دلائل کے ساتھ اوپر گزر چکی ہے، مزید تفصیل کی اس گزشتہ بحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی) فرمائشی جہیز سے بھی بڑھ کر قبیح اور شنیع بلکہ شرمناک وہ رسم ہے، جو ''تلک'' کے نام (یا دوسرے ناموں) سے بعض جگہ رائج، جس میں واقعۃً شوہر خرید ا جاتا ہے یہ رسم تو اسی حیاء سوز بلکہ انسانیت سوز ہے، کہ اس کی مذمت کے لئے الفاظ مشکل ہے، مگر یہ رسم ہے کہ ''اکاس بیل'' کی طرح پھیلتی اور بڑھتی جارہی ہے، اس لئے علمائے امت اور مصلحین کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، انہیں چاہئے کہ اس کے خاتمہ اور بیخ کنی کے لئے اپنی تمام کوششیں صرف کردیں ورنہ آیت: ''واتقو

افتنة لا تصیبنّ الذین ظلموا منکم خاصة'' (آیت کامفہوم یہ ہے کہ اس غذاب سے ڈروجوصرف ان ہی لوگوں پر نہیں آئے گا جو گناہوں میں مبتلہ ہوئے (بلکہ ان پر بھی آسکتا ہے جو اگر چہ خودتو گناہوں سے بچے رہے مگر گناہ میں مبتلہ لوگوں کی فکر نہیں کی۔سورۃ الانفال آیت:۔۲۵) سے جو عید سامنے آتی ہے اس کا تصور بھی ہی ہر باخبری کولرزہ برآندام کرنے کے لئے کافی ہونا چاہئے۔ اس قبیح رسم (جس، کی مذمت کیلئے صحیح الفاظ بھی ملنا مشکل ہیں) کی طرف سے غفلت برتنایا اس بارے میں چشم پوشی سے کام لینا اب کسی طرح مصلحین وعلماء کیلئے گوارا بلکہ جائز نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے کہ ہر جگہ ہزاروں جوان لڑکیاں، خاص طور پر پڑھی لکھی لڑکیاں، بن بیاہی بیٹھی ہیں، جن میں سے بعض خودکشی تک کر لیتی ہیں، اس کی ایک مثال کانپور کا حالیہ واقعہ ہے جس میں تین لڑکیاں نے خودکشی کی) اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، مرتد بھی ہو جاتی ہیں، اگر اس کی طرف فوری توجہ نہیں کی گئی تو اس طرح کے واقعات اور بڑھ جائیں گے، جن کی ذمہ داری سے مسلمان خاص طور سے باثر لوگ اور اہل علم نہیں بچ سکیں گے، اس سلسلہ میں ''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' اہم رول ادا کرسکتا ہے کہ اس کے مقاصد میں ''اصلاحِ معاشرہ'' بنیادی حیثیت رکھا ہے، اس سے بڑھ کر اصلاح کی اور کون سی ضرورت ہوگی! اس کے علاوہ ہر جگہ کے باشعور عوام بھی مختلف طریقوں سے اس رسم کی بیخ کنی میں مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں، مثلاً ایسی شادیوں کا مکمل بائیکاٹ کریں جہاں زیادہ جہیز دیتے یا ''تلک'' جیسی اور کوئی رسم ہوتے دیکھیں، اور پھر جس جگہ لڑکے یا اس کے سرپرستوں کو لڑکی والوں سے مطالبات کرتے دیکھیں یا سنیں تو ان کے خلاف ایسی فضا بنائیں کہ ان کا معاشرہ میں رہنا دشوار اور کسی لڑکی کا ملنا محال ہو جائے، اس اِکٹھا ہوئے ہوں اس مسئلہ کی شرعی وسماجی حیثیت نمایاں کی جائے، اور اس کی حرمت وقباحت ذہنوں میں بٹھائی جائے، اور بتایا جائے کہ اس طرح کے مطالبہ کے بعد جو مال بھی ملے گا وہ شرعاً رشوت ہوگا (دلائل اوپر گزر چکے ہیں) جس کا لینا دینا دونوں حرام ہے (جس طرح سود کا لینا دینا)۔علامہ شامیؒ نے تو (جیسا کہ اوپر گزرا) اس طرح کے مال کو ''سُحت'' کہا ہے، اور ''ربا'' و ''سحت'' (حرام طریقہ سے مال کا استحصال) وہ سنگین جرم ہے جس کی وجہ سے متعدد جگہ قرآن مجید (سورۃ النساء:۱۵۵ تا۱۶۱۔سورۃ المائدۃ:۴۲، ۶۲، ۶۳) میں یہود کی شدید مذمت کی گئی ہے، اور اسے قتل انبیاء جیسے جرائم کے ساتھ ذکر کر کے انہیں لعنت اور سخت عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے، اور حدیث شریف میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:۔

لا یدخل الجنة لحم نبت من السحت ،وکل لحم نبت من السحت کانت النار اولی به.

ترجمہ:۔سحت یعنی حرام مال جس نے استعمال کیا ہو، اس کے لئے جہنم کی آگ زیادہ مناسب ہے (یعنی ایسا شخص جہنم کو مطلوب ہے) اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے:۔لا یدخل الجنة جسد غذی بالحرام (مشکوٰۃ ج:۱ ص:۲۴۲،

ج:۱ ص:۲۴۳ (مطبوعہ اصح المطابع دہلی)　﴿رواه البیهقی﴾

ترجمہ:۔حرام غذا سے پلا ہوا جسم نہیں جا سکے گا۔اور جب تک بھی استعمال کرے گا گناہگار رہے گا، تو کیا کسی مسلمان کی دینی حس اس درجہ مردہ ہوسکتی ہے کہ وہ پوری عمر گناہ اور ''حرام'' میں مبتلا رہے، یہ بھی بتانا شاید بے محل نہ ہو کہ حرام طریقہ سے حاصل شدہ چیزوں کے

استعمال سے نماز اور دعا بھی قبول نہیں ہوتی، حدیث شریف میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:۔

من اشتری ثوباً بعشرۃ دراھم وفیہ درھم حرام لم یقبل اللہ صلاۃ ما دام علیہ. (مشکوٰۃ ج:۲ ص:۲۴۳)

ترجمہ:۔اگر کسی نے کوئی کپڑا (مثلاً) دس درہم (تین گرام کے قریب وزنی چاندی کا ایک سکہ) میں خریدا اور اس میں ایک درہم بھی حرام مال کا ہے تو اس کی اس وقت تک نماز قبول نہ ہوگی جب تک وہ کپڑا جسم پر ہے۔

نیز صحیح مسلم میں ہے:۔

ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا ......ثم ذکر الراجل یطیل السفر اشعت أغبر یمد یدیہ الی السماء حرام وغذیَ بالحرامِ فانی یستجاب لذلک. (صحیح مسلم ج:۔۳۲۶ (کتب خانہ رشیدیہ، دہلی)

ترجمہ:۔اللہ پاک ہے اس لئے پاک (کمائی کی) چیز ہی قبول فرماتا ہے، پھر آپ ﷺ نے ایسے شخص کا (مثلاً) ذکر کیا جو طویل سفر میں ہونے کے باعث خستہ حال ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگ رہا ہے، مگر اس کی دعا قبول نہیں ہوتی کیونکہ اس کے کھانے پینے کا سامان اور لباس حرام (کمائی کا) ہے۔کیا کوئی ایسا شخص جسے آخرت پر کامل یقین ہو وہ تمام عمر کی نمازیں برباد کرنے اور خدا تعالیٰ کے یہاں مسلسل گناہ میں مبتلا رہنے میں پیش ہونا گوارا کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ایسے ''تلک'' اور فرمائشی جہیز جیسے مال کے لینے سے اسے اس طرح بچنا چاہئے جس طرح سانپ بچھو اور دوسرے زہریلے اور خطرناک جانوروں کے اثرات زیادہ اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں، جبکہ ''حرام'' مال کے خطرناک اثرات اس عالم میں بھی پڑیں گے اس، کے بعد اس عالم تک برقرار رہیں گے جسے آخرات کہتے ہیں، اعاذنا اللہ مَن شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

یہاں ایک اور حدیث کا بیان کرنا شاید بے محل نہ ہوگا، جس میں فرمایا گیا ہے کہ اس طرح غیر شرعی طریقہ سے حاصل شدہ مال میں برکت بھی نہیں ہوتی، یعنی جلد فنا ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اپنے ساتھ بہت سے دنیاوی مصائب اور تکالیف بھی لاتا ہے، اور یسا شخص اگر صدقہ کرتا ہے (جو عموماً مصیبتوں کے ٹالنے کا سبب بنتا ہے لیکن اس کا) تو وہ بھی قبول نہیں ہوتا (اور مصیبتیں نہیں ٹالتیں بلکہ برقرار رہتی ہیں) اور اس کا بھی خطرہ ہے کہ ایسا مال مرنے کے بعد تک باقی رہتا ہے تو وہ اپنے پیچھے نہایت خطرناک اثرات چھوڑتا ہے، اصل حدیث (فرمانِ رسول اللہ ﷺ اس طرح ہے): **لا یکسب عبد مال حرام فیتصدق منہ ولا ینفق منہ فیبارك لہ فیہ ولا یترکہ خلف ظھرہِ الا کان زادہُ الی النار.رواہ احمد.** (مشکوٰۃ ج:۲ ص: ۸۶ (مطبوعہ دمشق) حدیث کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے)۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے کہ وہ اپنی مرضیات پر چلائے اور ہر اس برائی سے بچائے جس کا نتیجہ دنیا میں خراب، اور خدا کی ناراضگی کی صورت میں نکلے۔

ربناتقبل مِنّا اِنّک اَنت السّمیعُ العلِیم ط